سلطنت مغلیہ کا زوال اور شاہ ولی اللہ

پروفیسر فری لینڈ ایبوٹ

آخری عظیم مغل فرمانروا اورنگ زیب کی سلطنت بہت حد تک گزشتہ شوکت و عظمت کی آئینہ دار تھی، لیکن اس کے جانشینوں کی حکومت تو محض اس سلطنت کا ایک سایہ تھا، اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کو راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کی مسلسل بغاوتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا جانشین جہاندار شاہ عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اور ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اسے مار ڈالا گیا۔ اسی زمانے میں دربار شاہی تورانیوں اور ایرانیوں کی باہمی چپقلش کا رزم گاہ بن گیا۔ اور دکن، بنگال اور اودھ کے صوبےدار نیم خود مختار ہو گئے، مرہٹوں کو موقع ملا، اور انہوں نے شمالی ہند کا رخ کیا۔ اس اثنا میں ایران سے نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اور بے شمار دولت، زر و جواہر لوٹ کر لے گیا۔ اس کے بیس سال بعد مرہٹے دہلی پر قابض ہو گئے، لیکن چار سال نہیں گزرے تھے کہ پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست فاش دی اور شمالی ہند میں ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا لیکن اس کامیابی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، اور احمد شاہ ابدالی واپس افغانستان چلا گیا۔

---

[1] اصل مضمون انگریزی میں امریکہ کے مشہور رسالے "دی مسلم ورلڈ" میں چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے امریکہ کی ٹفٹس یونیورسٹی، میڈفورڈ، میساچوسٹس، میں پروفیسر ہیں۔ اور پاکستان میں کچھ عرصہ رہ چکے ہیں یہاں اس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

بابر نے ۱۵۲۶ء میں اور اکبر نے ۱۵۵۶ء میں اسی پانی پت میں فتح حاصل کر کے اپنی اپنی سلطنتوں کی بنیاد رکھی تھی۔ اگرچہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی اس تیسری جنگ میں مسلمانوں فوجوں کو فتح ہوئی تھی۔ لیکن یہی وہ وقت تھا، جب کہ ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے مغل سلطنت ختم ہو گئی۔ یہ سلطنت گو برائے نام بعد بھی قائم رہی، لیکن مسلمان اور ہندو دونوں نڈھال ہو چکے تھے چنانچہ اس سے ایک تیسری طاقت انگلستان نے فائدہ اٹھایا اور وہ اٹھارھویں صدی کے وسط سے دونوں پر غالب آنے لگی قدرتاً مغل سلطنت کے اس دردناک انجام نے ان راسخ العقیدہ مسلمانوں کو جو قسمت پر قانع ہونے کو تیار نہ تھے، سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس ضمن میں زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ یہ زوال اورنگ زیب کے فوراً بعد، بلکہ اس کے آخری زمانے ہی میں یک بارگی شروع ہو گیا تھا۔ اور یہ اورنگ زیب وہی تھا جسے راسخ العقیدہ مسلمان مغل فرمانرواؤں میں سب سے اچھا مسلمان سمجھتے تھے۔ سلطنت کے اس زوال سے ایک بار پھر وہ سوالات ابھرے، جو کم سے کم چودھویں صدی عیسوی سے ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اس برصغیر میں دوسرا بڑا عالم دین پیدا کیا، جس کی راسخ العقیدگی ہر شک و شبہ سے بالا تھی لیکن اس کے ساتھ ہی، ان حالات کے مطالعہ کی وجہ سے جن میں اسے زندگی گزارنی پڑی، اس نے ان چیزوں پر زیادہ زور نہیں دیا، جن پر اس کے پیش رو علمائے دین دیتے تھے۔

احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ اورنگ زیب کی موت سے چار سال پہلے پیدا ہوئے اور پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد کے سال میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی زندگی اس دور میں گزری جب سلطنت اور اس کے ساتھ مسلم معاشرہ بڑی سرعت سے زوال پذیر تھا۔ شاہ ولی اللہ کی یہ کوشش تھی کہ انہیں کوئی ایسا راستہ مل جائے جس پر چل کر مسلم معاشرہ از سرِ نو مضبوط ہو جائے، اور جیسا کہ ایک عالم دین سمجھتا ہے وہ اسلام کے اصولوں سے پھر ایک بار ہم آہنگ ہو۔

شاہ ولی اللہ کے والد صوفی بھی تھے اور عالم دین بھی۔ ایک وقت میں وہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے منسلک ہوئے، لیکن جلد ہی اس سے الگ ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنا مدرسہ قائم

کیا۔ جہاں وہ ایسی تعلیم دیتے تھے جس سے صوفیاء اور راسخ العقیدہ علماء ایک دوسرے سے قریب ہو سکیں۔ ان کے بعد ان کے نامور فرزند بھی اسی راہ پر چلے۔

شاہ ولی اللہ سترہ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور آن ان کی جگہ درس دینے لگے ۱۷۳۰ء میں وہ حج کو گئے اور ۱۷۳۳ء میں لوٹے، اور اس کے بعد تیس سال تک ان کی باقی زندگی تمام تر اسلامی علوم کے مطالعے، زوال آمادہ سلطنت کے دفاع اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف رہی

شاہ ولی اللہ کی شخصیت قرون وسطیٰ اور دور جدید کی درمیان کی کڑی ہے، جیسے کہ یورپ میں دانتے تھا۔ آج کے پاکستان میں تمام گروہ، خواہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے سختی سے پابند ہوں یا نہ ہوں، شاہ ولی اللہ سے ذہنی انتساب کے مدعی ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ شاہ ولی اللہ مذہبی عقائد میں جدت پسند (ماڈرنسٹ) نہیں ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنے دور کے پریشان کن حالات کا جس طرح تجزیہ کیا اور اس سے وہ جن نتیجے پر پہنچے، بعد میں آنے والے جدت پسندوں نے اسے اپنے ڈھب پر ڈھال لیا۔ جہاں تک شاہ ولی اللہ کا تعلق ہے مذہب میں ان کا نقطہ نظر حقیقی طور پر راسخ العقیدگی کا حامل ہے۔ اور وہ ہندوستان کے پہلے عظیم عالم دین یعنی شیخ احمد سرہندی کے نقطہ نظر سے جنہوں نے کہ اکبر کی اس عجیب وغریب کوشش کی کہ وہ سیاسی مقاصد کے لئے مختلف مذاہب کا ملا جلا ایک عقیدہ ترتیب دے، سخت مخالفت کی تھی زیادہ مختلف نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور شیخ احمد سرہندی دونوں صوفیاء کے نقشبندی طریقے سے منسلک ہیں، لیکن دونوں میں فرق اتنا ہے کہ آخر الذکر اس دور میں تھے، جب اسلامی سلطنت اپنے عروج کی طرف گامزن تھی۔ اور شاہ ولی اللہ کا وہ دور ہے، جب یہ سلطنت اپنی انتہائی پستی کی قریب تھی، بہر حال ہر دو کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ اور دونوں اسی سے عہدہ برآ ہونے میں کوشاں رہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کو کیسے تقویت دی جا سکتی ہے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کا ذہن زیادہ دوررس تھا اور انہوں نے اسلام کے فعال اور حرکت آفریں کردار کو زیادہ عمیق تجزیے کے ذریعہ، یا اسے یوں کہہ لیجئے، کم عربیت کے زیر اثر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی صحیح ترین تعریف یوں ہوسکتی ہے کہ وہ ایک انقلابی عالم دین تھے۔ وہ جس دور میں تھے، وہ دور ایک انقلاب کے لئے بے تاب تھا۔ انہوں نے بڑی مستقل مزاجی سے اور مسلسل خطوط اور رسائل کے ذریعہ اس امر کی نشان دہی کی کہ ان کے معاشرے میں کیا خرابیاں ہیں اور بتایا کہ ان کی کیسے اصلاح ہوسکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی طاقت کو اس سرزمین میں بحال کرنا ہے، تو اس کے لئے ایک زبردست اقدام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ ساری عمر اس مقصد کی تکمیل کے لئے سرگرم کار رہے۔ ہوسکتا ہے کہ پانی پت کے معرکے کے وقوع پذیر ہونے میں ان کے قلم کا بھی دخل ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ایک خط لکھا تھا۔ یہ اقدام دراصل ایک کوشش تھی مسلمانوں کو قبل اس کے کہ ان میں نئی زندگی پیدا ہو، تباہی سے بچانے کی۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم شاہ ولی اللہ کے وہ افکار و خیالات ہیں، جو انہوں نے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے سلسلے میں پیش کئے۔

ایک مخلص اور متقی عالم دین کی نظر میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کا ایک ہی حل تھا، اور وہ یہ کہ خلافت راشدہ جیسے نظام کو بروئے کار لایا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے ہاں خلافت راشدہ کے بعد بادشاہت آگئی۔ اور بادشاہ خواہ اہل ہوتا یا نا اہل، مسلمان اس کے سامنے سرنگوں ہونے لگے۔ اس سلسلے میں وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ زمانہ جب مسلمان سرتاپا ایمان تھے اور ان میں اتحاد عمل تھا، اس زمانے کے سماجی اور سیاسی نظام میں جو روح کارفرما تھی، اسے از سر نو زندہ کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ سمجھتے تھے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں جو حالات تھے، ان کی طرف بجنسہ لوٹنا اب ممکن نہیں۔ اسلام کے متعلق ان کا تصور ایک خالص عالمگیر مذہب کا ہے۔ اگرچہ اسے دنیا کے سامنے عربی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی مذہبی روایت خلا میں ظہور پذیر نہیں ہوسکتی۔ اب اگر ایک مذہب ایک خاص ثقافتی قالب میں جو مذہب اسلام کے معاملے میں عربیت ہے پیش کیا گیا ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے عربی مراسم و طریقہ ہائے کار کا پابند کر دیا گیا ہے۔

ایک خالص مذہب نہ صرف مختلف ثقافتوں میں مختلف صورتوں میں پیش کیا جائے گا۔ بلکہ ایک ہی ثقافت کے مختلف ادوار میں اس کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ لیکن اس ضمن میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مذہب سے اس کے خالص حصے کو ان اجزا سے جو محض اس کے ثقافتی قالب اور سانچے ہیں، کیسے منتخب کیا جائے۔ گو شاہ ولی اللہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتے لیکن انہوں نے یہ سوال اٹھا کر (اگرچہ ان سے پہلے حنفی مکتب فکر میں، بلکہ اس سے بھی پہلے شیعہ سنی اختلاف کے سلسلے میں، یہ سوال اٹھایا جا چکا ہے) قریب قریب لامحدود نظریات و قیاسات کے دروازے کھول دیئے۔ مخصوص عربی ثقافتی قالب کی حدود سے باہر اسلامی خیالات و افکار کی نشر و اشاعت کے لئے شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ہندوستان میں اس وقت بہت کم مسلمان عربی جانتے تھے، لیکن فارسی ان کے اونچے طبقے کی زبان تھی۔ ان کے اس اقدام سے گو بہت سے قدامت پسند علماء ناراض ہوئے (وہ کلام اللہ کے معاملے میں کسی قسم کی تبدیلی کے خواہ وہ ترجمہ ہی کیوں نہ ہو، عقیدۃً خلاف تھے) لیکن ان کا یہ اقدام بہت مقبول ہوا۔ بعد ازاں شاہ ولی اللہ کے دو صاحبزادوں نے قرآن کا اردو جیسی نئی زبان میں ترجمہ کیا، جو مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ بڑی سرعت سے فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے اس اقدام سے، جس نے بے شک بعد والوں کے لئے راستہ صاف کر دیا، قرآن مجید کے عام لوگوں کی زبان میں یہ ترجمے کہیں زیادہ انقلابی اقدام تھے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان کے معاشرے کے انحطاط کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس میں حد سے زیادہ اسراف پھیل چکا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہاں صحیح اسلامی روایات دوبارہ مروج ہوں، تو اس بات کا بہت زیادہ یقین ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ سے طاقت اور اقتدار جو جا رہا ہے وہ بحال ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ مسلم معاشرے کو مضبوط کر کے مذہب اسلام کو مضبوط کرنا چاہتے تھے یہ ان کا بنیادی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر مذہب و عقیدہ مضبوط ہو گا، تو لازماً ملت بھی مضبوط ہو گی۔ اب مسلم معاشرے کو مضبوط بنانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ ہندوانہ رسمیں جنہیں برصغیر کے مسلمانوں نے

اختیار کر لیا تھا، انہیں ختم کیا جائے، چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ان کے خلاف لکھا اور بتایا کہ اسلام کے عہد اوّل میں ان کا کہیں وجود نہ تھا۔ خاص طور سے انہوں نے مسرفانہ رسوم کی سخت مخالفت کی اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ان رسموں کی اس لئے مخالفت نہیں کرتے کہ وہ ہندوانہ ہیں بلکہ اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ غیر اسلامی ہیں۔ اس بارے میں ان کے ہاں محرک جذبہ وہ تعصب (Bigotry) نہیں، جو شیخ احمد سرہندی کے ہاں پایا جاتا ہے اپنی ممتاز ترین انسائیکلوپیڈیا جیسی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں وہ رومی و ایرانی سلطنتوں کے زوال کے اسباب گناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہیں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں، تم اپنے شہر کے فرمانرواؤں کی زندگیاں دیکھ سکتے ہو۔

شاہ ولی اللہ نے یہ بھی دیکھا کہ معاشرے کے ضعف کا باعث صرف اسراف اور ہندوانہ رسمیں ہی نہیں، بلکہ مسلمان خود آپس میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ اور ان میں حقیقی اتحاد نہیں۔ ایک طرف صوفیہ کے چاروں طریقے ایک دوسرے کا بہت کم پاس کرتے ہیں پھر ان میں اور راسخ العقیدہ گروہ میں مسلسل آویزش ہے۔ اور جہاں تک مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہ کا تعلق ہے، اس کی صوفیہ اور شیعہ دونوں سے ٹھنی ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ مسلمانوں کے ان مختلف فرقوں کے اتحاد کے لئے اسلام کے دور اول کو اساس بناتے ہیں جب کہ نہ صوفی اتنی اہمیت رکھتے تھے اور نہ سنی شیعہ اختلاف تھا۔ شاہ ولی اللہ میں جو علمی شان ہے، وہ برابر توازن و اعتدال پر زور دیتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ چیز ہے جس پر وہ بار بار زور دیتے ہیں۔ وہ بڑی شدومد سے اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں عدل و انصاف کی شکل میں یہ توازن و اعتدال موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ کبھی بھی شیخ احمد سرہندی یا اپنے ہم عصر مصلح عرب محمد ابن عبدالوہاب کی طرح ایسے خالص انقلابی نہیں ہوئے کہ جن کی نظروں میں یا تو چیزیں بالکل سیاہ ہوتی ہیں، یا بالکل سفید۔

مفاہمت اور مصالحت شاہ ولی اللہ کا خصوصی امتیاز ہے۔ لیکن جہاں تک سیاسی تخریب کے ان عناصر سے نمٹنے کا سوال ہے، جو اسلام کے لئے خطرہ بن گئے تھے جیسا کہ جوش میں آئے ہوئے مرہٹے

جاٹ اور سکھ، وہ البتہ اس سے مستثنیٰ تھے ایک اور مسئلہ تھا جو صوفیا اور راسخ العقیدہ گروہ میں بہت عرصے سے مابہ النزاع تھا۔ اور جس کے بارے میں شیخ احمد سرہندی کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اسے موثر طریقے سے حل کر دیا ہے ان کے نزدیک صوفیہ کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے وجود کی وحدت کا اثبات کیا اور یہ کہ یہ سب وہم تھا۔ اس کے برعکس شیخ احمد سرہندی کا کہنا تھا خالق اور مخلوق دونوں کے الگ الگ وجود ہیں۔ لیکن بعض صوفیہ کو اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ اور دونوں گروہوں میں یہ نزاع جاری تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اسے یوں حل کیا کہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ راہ راست پر ہیں۔ ساری بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو دیکھنے والے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں نقطہ ہائے نظر صحیح مکاشفے پر مبنی ہیں اور شیخ احمد سرہندی نے جو کچھ کہا ہے، وہ درحقیقت ابن عربی ہی کی تائید ہے۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں "اگر حقائقِ واقعی پر استعاروں اور تشبیہوں کو نظر انداز کر کے غور کیا جائے، تو دونوں نقطہ ہائے نظر کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے" اس بارے میں یہ کہا گیا ہے، کہ شاہ ولی اللہ نے دراصل وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی یہ جو تعبیر کی ہے، اس سے راسخ العقیدہ اسلام کو ایک فلسفیانہ و متصوفانہ اساس مل گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے صرف صوفیہ اور راسخ العقیدہ گروہ کے نزاع کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ خود صوفیہ میں جو نزاع تھا، اسے بھی ختم کرنا چاہا۔ انہوں نے اپنے ہاں چاروں طریقوں کی بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا، جو اب تک مدرسہ دیوبند نے ان کے زیر اثر قائم رکھا ہے۔ ان کے مصالحت پسند مسلک کی ایک اور مثال یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے راسخ العقیدہ لوگوں کے معمول کے خلاف اس پر مصر نہیں تھے کہ شیعہ مسلمان نہیں۔

شاہ ولی اللہ کی رائے میں مسرفانہ زندگی اور داخلی نزاعات کے علاوہ ایک اور چیز جو مسلم معاشرے کی تباہی کا باعث بنی، وہ فقہی امور میں ان کی اندھی تقلید تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک صحت مند معاشرے کے لئے ارتقاء اور تبدیلی لازمی ہے۔ اور چار مذاہب فقہ میں سے کسی ایک مذہب کی اندھی تقلید سے مسلم معاشرے کو کوئی تقویت نہیں ملی

اس معاملے میں شاہ ولی اللہ شیخ احمد سرہندی اور شیخ ابن عبدالوہاب سے، جو ان کی طرح اندھی تقلید کو اسلام کی کمزوری کا باعث سمجھتے تھے، اختلاف نہیں رکھتے۔ برصغیر کے مسلمانوں پر شاہ ولی اللہ کے ان خیالات کا شاید سب سے زیادہ اثر پڑا ہے، جن میں کہ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

بحیثیت مجموعی شاہ ولی اللہ کے افکار و آرا کے بارے میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ اگرچہ وہ پورے کے پورے عالم دین تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے معاشرے کو عمرانی نظر سے دیکھا اور سمجھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں کہ مذہبی احکام کی محض اس لئے تعمیل ہو کہ وہ اصلاً اللہ کی طرف سے ہیں بلکہ اس لئے بھی ان کی تعمیل ہونی چاہیئے کہ ان سے افراد اور معاشرہ دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے احکام صرف ثواب و عذاب کا معیار نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد معاشرتی بھی ہوتا ہے کہ ان سے معاشرے کو اور افراد کو، جن سے کہ معاشرہ عبارت ہے، فائدہ پہنچے۔ اس نقطہ نظر میں کوئی چیز غیر اسلامی نہیں۔ بے شک چارسو سال پہلے مشہور مورخ ابن خلدون بھی یہی بات لکھ چکے ہیں اب اگر مذہب تمام چیزوں پر حاوی ہے، جیسا کہ اسلام تعلیم دیتا ہے تو یقیناً اسے معاشرے پر بھی حاوی ہونا ہوگا۔

شاہ ولی اللہ کی ایک عالم دین اور ایک نیک و متقی مسلمان ہونے کی جو زبردست شہرت تھی اور اس کے ساتھ انہوں نے جو اسلام کے اس عمرانی و معاشرتی پہلو پر زور دیا اس کی بنا پر انہوں نے ایک ایسا غیر دینیاتی اساس بہم کردیا ہے، جس پر بعد میں آنے والے ارباب فکر جو خالصاً دینیاتی ذہنی فضا سے دور ہیں۔ نئی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر اسلامی احکام اس غرض کے لئے ہیں کہ ان سے معاشرتی فوائد پہنچیں، تو اس صورت میں ایک حکم کو جانچنے کا قدرتاً یہ معیار ہوگا کہ وہ کس حد تک اس غرض کو پورا کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں جب کہ ہر طرف سے ثقافتی نمونوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ انہیں جانچنے کا اس قسم کا معیار کافی سمت ہے۔

شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ علمائے دین کی قرون وسطیٰ کے فقہائے مجتہدین کے آراء کی غلامانہ تقلید معاشرے کے لئے ایک خطرہ ہے۔ ان کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ وہ اصل و خالص دین کے لئے حدیث اور قرآن کی طرف رجوع کریں۔ اور پھر اپنے زمانے اور اپنے ملک کی ضرورتوں پر اس کا اطلاق کریں۔ بے شک اس معاملے میں انہیں قرون وسطیٰ کے مجتہدین کو نظر انداز بھی کرنا ہوگا، جو یقیناً بڑا انتہا پسندانہ اقدام ہے لیکن شاہ ولی اللہ کے زمانے میں یہ چیز کوئی زیادہ نادر نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کے لئے جس کا دین کا مطالعہ زیادہ نہیں، کسی نہ کسی عالم کی مدد ضروری ہے لیکن یہ صرف اس بنا پر ہو کہ وہ عالم قرآن اور سنت پر عبور رکھتا ہے، شاہ ولی اللہ باوجود اس بات پر اعتقاد رکھنے کے، کہ قرآن بالکل ایک واضح کتاب ہے وہ اس بارے میں اس حد تک نہیں گئے کہ وہ یہ کہیں کہ اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بہر حال وہ اس سلسلہ میں اپنے مخصوص انداز میں علماء کے سامنے ایک مصالحت پسندانہ متبادل رکھتے ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ اگر وہ ان سے اپنی زیادہ بات نہیں منوا سکتے تو تھوڑی سی ہی منوا لیں اس ضمن میں ان کا کہنا یہ ہے کہ فقہ کے جو چاروں مذاہب ہیں، علماء ان سب کو برابر سمجھیں، اور ان میں سے کسی خاص کی طرف اس طرح توجہ نہ دی جائے کہ دوسرے نظر انداز ہو جائیں۔

قرون وسطیٰ کے فقہاء کی اسلامی فکر پر جو سخت گرفت تھی، شاہ ولی اللہ اسے ڈھیلا کرکے برصغیر کے اسلام میں اتنی لچک پیدا کرنا چاہتے تھے کہ اس کو نئے زمانے اور نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ اصلاح اور "ریفارم" چاہتے ہیں، لیکن ان کے پیش نظر بظاہر کوئی بڑی تبدیلی نہیں تھی۔ بہر حال انہوں نے ایسے طریقوں کی نشان دہی ضرور کردی ہے جن کی مدد سے وہ افراد جنہیں مسلمان علماء سے زیادہ بھرپور معاشرتی تبدیلیاں درپیش ہیں، منطقی طور سے ایسی اصلاحات اور

"ریفارمز" تجویز کرسکتے ہیں۔ جن کا شاہ ولی اللہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے دور میں جس لچک کو کافی سمجھا تھا، بعد میں آنے والے مصلحین نے اسے مایوس کن طور پر ناکافی قرار دیا۔ درحقیقت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے نتیجے میں دو طاقتور تحریکیں ابھریں۔ ان میں سے ایک جس کا بہت زیادہ براہ راست شاہ ولی اللہ سے تعلق تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ قدامت پسند ہوتی گئی اور اس کا انداز بھی زیادہ سے زیادہ خشک ظاہر پرست ہوگیا۔ اور دوسری تحریک زیادہ سے زیادہ آزاد خیال ہوتی گئی اور اس کی اسلام کی تعبیرات بھی زیادہ سے زیادہ تجریدی اور نظریاتی ہوگئیں۔ جہاں تک اپنے دور کے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے متعلق خود شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا تعلق ہے شاید سوائے سیاسی میدان کے اور وہ بھی صرف عارضی طور پر، وہ زیادہ تر ناکام رہیں، لیکن اس کے باوجود ان کا اثر و نفوذ پاکستانی و ہندوستانی مسلم ذہن پر آج بھی بہت زیادہ ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہی علم (اسرارِ دین) ہے، جس سے آدمی پکا مسلمان ہوتا ہے اور اس کا ایمان مثل ایسے شخص کے کامل یقین کے پختہ ہوجاتا ہے، جس کو کسی نہایت سچے شخص نے یہ بات کہی ہو کہ سنکھیا زہر قاتل ہے۔ اس کے کھانے سے آدمی مرجاتا ہے۔ اور اس شخص نے بسبب اس قائل کی سچائی اور معتبری کے اس کی تصدیق کی اور پھر قواعد علم حکمت سے یہ بات بھی جانی کہ زہر میں حرارت اور یبوست بے انتہا ہے۔ اور وہ دونوں خاصیتیں انسان کے مزاج کے برخلاف ہیں اور اس لئے اس کو مار ڈالتی ہیں اور اس بات کے جاننے سے اس کا یقین اس قائل پر اور اس کی بات پر اور زیادہ پختہ ہوجاتا ہے۔ پس اسرار دین کے علم کا یہی نتیجہ ہے کہ وہ انسان کو ایسا پختہ کردیتا ہے کہ کسی طرح ڈگمگا ہی نہیں سکتا۔
شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگرچہ عام عالموں نے فقہ کو لب لباب علوم دین کا سمجھا ہے۔ مگر ان کے نزدیک علم اسرارِ دین ہی سب کا سرتاج ہے ...

(حجۃ اللہ البالغہ کا یہی موضوع ہے) ۔ سر سید احمد خاں